بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مشرقِ وسطیٰ اور سامراجی سیاست

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

خورشید احمد

ایک نئی اور خوفناک خلیجی جنگ کے شعلے بڑی تیزی سے عراق کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں' امریکہ اور برطانیہ کے لڑاکا طیارے اور میزائل سرزمین عراق پر آگ اور خون کی بارش شروع کر چکے ہوں۔ گو' اس کا بھی امکان ہے اور ہماری نگاہ میں غالب امکان یہی ہے کہ وسیع پیمانے پر لام بندی کے بعد ایک بار پھر وقتی طور پر خاک و خون کی یہ ہولی موخر کر دی جائے اور اور بلی اور چوہے کا کھیل اس طرح جاری رہے جس طرح خصوصیت سے پچھلے پچاس برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ فضا کی آلودگی میں کوئی کمی نہ ہو' امن و آشتی کا حصول محال رہے' عوام اپنے حقوق سے محروم رہیں' معاشی وسائل امریکی اور یورپی اقوام کے مفاد میں استعمال ہوتے رہیں' حکمران بدستور عیش و عشرت کرتے رہیں' مسئلہ فلسطین اور بھی الجھ جائے' اسرائیل کی بالادستی محکم تر ہوتی جائے اور امریکہ معاشی' سیاسی اور عسکری اعتبار سے علاقے کا اصل حکمران رہے۔ جنگ' جنگ کی دھمکی' جنگ کے لیے فضا بنانا اور جنگ سے گریز یہ سب دراصل ذریعہ ہیں نئے نئے عنوانوں سے اپنی گرفت کو علاقے پر مضبوط کرنے اور امت مسلمہ کو اس مرکزی اور تاریخی اہمیت کے علاقے میں حقیقی آزادی اور اس کے دین و ایمان' ثقافت و تہذیب اور عوامی امنگوں کے مطابق ترقی کے مواقع اور ثمرات سے محروم رکھنے کا۔

مشرق وسطیٰ ایک آئینہ ہے جس میں پوری امت کے المیے کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ' مغربی اقوام اور اقوام متحدہ' اسرائیل' عرب دنیا کے حکمران' ترکی کی موجودہ قیادت' عراق کا حکمران ٹولہ اور صدام حسین یہ سب اس ڈرامے کے مختلف کردار ہیں۔ میدان جنگ کے نقشوں کا بننا اور بگڑنا اسی کا ایک حصہ

ہیں۔ تادیبی کارروائیاں (sanctions) اور ان میں سہولتیں' دعوے اور دلائل' حقیقی عزائم اور سازشیں' دھمکیاں اور کہہ مکرنیاں' وعدے اور وعدہ خلافیاں ان سب ہی سے اس ڈرامے کے ڈائیلاگ عبارت ہیں--- البتہ اس پورے معاملے میں' بدقسمتی سے' جن کا کوئی رول نہیں وہ--- مسلمان عوام ہیں--- حالانکہ وہی زمین کے اصل وارث اور حق دار ہیں۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے بعد ڈرامے کا پلاٹ اور بھی کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اگر کوئی ابہام تھا تو وہ دور ہو گیا ہے اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ اس نقشے کے عین مطابق ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ حالات کا محض سطحی نظر سے جائزہ نہ لیا جائے بلکہ جو حقیقی کھیل کھیلا جا رہا ہے اسے سمجھا جائے اور دشمن کی اصل چالوں کا مقابلہ کرنے کے لیے امت کو بیدار اور تیار کیا جائے۔ عراق کی تازہ صورت حال وہ لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے جسے امت مسلمہ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔

بیسویں صدی میں مشرق وسطیٰ کی قسمت کا فیصلہ جن سامراجی قوتوں کے ہاتھوں میں رہا ان میں اولیں برطانیہ اور فرانس تھے' پھر اٹلی نے اپنا حصہ بنایا اور آخر کار امریکہ اور روس نے پنجے گاڑ دیے۔ مگر عالمی طاقت کے طور پر روس کی پسپائی کے بعد' اب امریکہ نقشوں میں رنگ بھرنے اور تصاویر بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔

پہلی جنگ کے اختتام (۱۹۱۸) سے پہلے ہی مشرق وسطیٰ کے نئے سیاسی جغرافیے کا نقشہ (geo-political map) بنا لیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد مئی ۱۹۱۶ کے اینگلو فرنچ معاہدے میں طے ہوئی جو سائیکس پی کاٹ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) کے نام سے معروف ہے اور جس کے تحت ان دونوں سامراجی طاقتوں نے پورے علاقے کی اپنے درمیان بندر بانٹ کر لی تھی۔ پھر ۱۹۱۷ کے اعلان بالفور کے ذریعے اس میں اسرائیل کے لیے جگہ بنائی گئی۔ ۱۹۲۰ کے معاہدہ سیورز (Treaty of Severs) کے تحت اگرچہ دولت عثمانیہ کا قصہ ختم کر دیا گیا تھا تاہم ترک مجاہدین کی عظیم جدوجہد نے اناطولیہ پر ترک اقتدار کو بچا لیا۔ پھر خلافت عثمانیہ کی تجہیز و تدفین اور سیکولر نظام کے قیام کی قیمت پر ۱۹۲۳ کے معاہدہ لوسان (Treaty of Lausanne) کے تحت ایک محدود علاقے پر ترک ری پبلک کو تسلیم کیا گیا' مگر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر!

ٹی ای لارنس جو برطانیہ کا جاسوس اور کارندہ تھا اپنی کتاب "حکمت کے سات ستون" (Seven Pillars of Wisdom) میں اس کھیل کے کچھ پہلو بیان کرتا ہے جو دولت عثمانیہ کو تباہ کرنے' عرب قومیت کو ابھارنے اور برطانوی استعمار کے قدم جمانے کے لیے کھیلا گیا۔ عربوں کو ترکوں کے مقابلے میں اٹھایا گیا اور دونوں میں اسلامی قومیت کی جگہ لسانی اور علاقائی قومیت کو فروغ دیا گیا۔ عربوں میں اپنی کامیابی کے بارے

میں لارنس دعویٰ کرتا ہے کہ "میرا مقصد ایک نئی قوم کی تشکیل تھا' اس کے کھوئے ہوئے رسوخ کی بحالی (I meant to make a new nation; to restore a lost influence) (کتاب مذکور' مطبوعہ لندن' ۱۹۴۰' ص ۲۳) نیز یہ سنہرا خواب بھی دکھاتا ہے کہ:

We could see a new factor was needed in the East, some power or race which would outweigh the Turks in numbers, in output and in mental activity. (ص - ۵۶)

ہم نے صاف دیکھ لیا تھا کہ مشرق میں ایک نئے عامل کا وجود ناگزیر ہے۔ ایک ایسی سیاسی طاقت یا نسلی قوت جو ترکوں پر اپنی عددی پوزیشن' پیداوار کی صلاحیت اور فکری حرکت کی بنا پر سبقت لے جا سکے۔

یہ نئی قوت بظاہر موعودہ عرب ریاست تھی جو کبھی وجود میں نہ آئی اور اس کی جگہ ایک درجن (اور اب ۲۲) عرب مقبوضہ علاقے وجود میں آئے اور ان سب پر مغربی اقوام کا تسلط قائم کیا گیا اور آخرکار اسرائیل کو علاقے کی سب سے مضبوط اور بالاتر ریاست بنا کر اسے امریکہ اور یورپی اقوام کی عسکری چھتری کا تحفظ عطا کیا گیا۔ ۱۹۱۹ کے معاہدہ ورسیلز (Treaty of Versailles)' لیگ آف نیشنز کے ۱۹۲۲ کے پروٹوکول آف مینڈیٹ سے لے کر ۱۹۴۸ کی اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین اور قیام اسرائیل کی قرارداد' اور اس کے بعد ۱۹۶۷' ۱۹۷۳ اور ۱۹۹۱ سے لے کر آج تک کی سلامتی کونسل کی قراردادیں' اور کیمپ ڈیوڈ سے لے کر اوسلو معاہدے تک' سب' دراصل شرق اوسط کو منقسم رکھنے' کمزور رکھنے اور اپنی گرفت میں رکھنے کے در و بست ہیں۔ اس پورے المیے کی تصنیف و تالیف میں جہاں سامراجی قوتوں کا کردار کلیدی تھا' وہیں علاقے کے اپنے لیڈروں کا کردار بھی کچھ کم فیصلہ کن نہ تھا۔ ذاتی اغراض' خاندانی اقتدار اور دولت کے حصول کے لیے ہر علاقے میں کچھ عناصر نے مغرب کی استعماری قوتوں کے دست و بازو کا کردار ادا کیا اور یہی صورت حال ناموں کی تبدیلی اور عنوانات کے تغیر کے ساتھ اس وقت تک جاری ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک عرب دانشور حلیم برکات اپنی کتاب' The Arab World: Society, Culture and State (مطبوعہ یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا پریس' برکلے' لندن ۱۹۹۳) میں ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے بعد کی صورت حال کی یوں منظر کشی کرتا ہے:

خلیج کی جنگ نے عربوں کے اس اعتماد کو متزلزل کر دیا کہ وہ خواب اور حقیقت کے درمیان خلا کو پر کر کے ایک نیا آغاز کر سکتے ہیں۔ اچانک انھوں نے اپنے کو ایک ایسی صورت حال میں پایا جو اس سے مختلف نہ تھی جس کا تجربہ انھیں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ آزادی اور اتحاد کے ایک نئے دور

کے بجائے وہ مغرب کے غلبے اور مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی دھمکیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے پرامید خوابوں کی جگہ پریشان کن مذاکرات نے لے لی ہے۔ عرب اپنی شکست اور ناکامیوں کا الزام مغرب پر رکھتے ہیں مگر اپنے آپ کو بھی قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ میں اس دعوے کو دہرانا چاہتا ہوں کہ احساس اجنبیت کی تباہ کن حالت عربوں کی موجودہ مصیبت کی ذمے دار ہے۔ میری بنیادی دلیل یہ ہے کہ عرب شہری بے اختیار کر دیے گئے ہیں کیونکہ انھیں سیاسی عمل سے خارج کر دیا گیا ہے، کنارے لگا دیا گیا ہے اور ان سیاسی اور مادی وسائل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے جو ایک سول سوسائٹی ان کے حوالے کرتی ہے۔ علاقے کے عوام معاشرے پر ریاستی جبر کی مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ عرب ریاستیں اور حکمران اپنے معاشرے کے خلاف ایک طاقت بن گئے ہیں، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عرب عوام اجنبیت کے شدید احساس کا شکار ہیں۔ عربوں کو فیصلوں پر اثرانداز ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کا اس میں کوئی دخل نہیں کہ تیل سے حاصل ہونے والی بیش بہا دولت اور ان کی محنت سے پیدا ہونے والے لامحدود وسائل کس طرح کام میں لائے جائیں۔ سیاسی اقتدار کی طرح معاشی طاقت بھی چند خاندانوں اور قبائلی سرداروں کا استحقاق ہو گئی ہے۔ بیرونی محاذ پر عرب، مغربی صیہونی بالادستی کا شکار ہیں۔ اندرونی محاذ پر وہ آزادی اور شرف انسانی سے محروم ہیں (ص ۲۶۹-۲۷۷)۔

یہ حالات کا ایک حقیقت پسندانہ اظہار ہے جو کمزوری کے اصل اسباب اور عوامل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود مغرب کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کا تجزیہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ صدر کارٹر کا قومی سلامتی کا مشیر، برزنسکی اپنی تازہ کتاب 'Out of Control' میں عرب دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

کش مکش اور عدم استحکام، مشرق وسطیٰ اور جنوبی یوریشیا پر محیط اسلامی علاقوں کی مرکزی اور مستقل حقیقتیں رہنے کا امکان ہے۔ عربوں کا روایتی عدم اتحاد، جسے مغربی طاقتیں جو عربوں کے تیل کی فراہمی پر اپنا کنٹرول رکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں، جان بوجھ کر بڑھاتی ہیں، مستقل علاقائی عدم استحکام میں اضافہ کرے گا۔ (Out of Control: Global Turmoil on the Eve of the Twenty-First Century, by Zbigniew Brzezinski, Simon and Schuster, New York, 1995. (ص ۲۱۴)

مشرق وسطیٰ میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد جو خونی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور جس طرح ایک بحران کے بعد دوسرا بحران اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور ایک ملک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اندرونی تناظر اور بیرونی قوتوں کے سامراجی کھیل کو سمجھا جائے۔ خلیج کی جنگ محض کویت پر عراق کے حملے کا نام نہیں (گو یہ اقدام ہر اعتبار سے قابل مذمت تھا اور ہے) بلکہ اسے اس پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنا ضروری ہے جو آج مشرق وسطیٰ کا المیہ بن گیا ہے۔

آج امریکہ اور برطانیہ عراق پر حملے کے لیے بہانے تلاش کر رہے ہیں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو من مانے معانی پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اگر بصیرت کی نگاہ سے ان تمام حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب ایک گھناؤنے ڈرامے کے پلاٹ نظر آتے ہیں۔ ایران میں اسلامی انقلاب' افغانستان میں تحریک جہاد اور فلسطین میں انتفاضہ وہ سنگ ہاے میل ہیں جو امت مسلمہ کے بالعموم اور عرب دنیا کے بالخصوص اسلامی احیا کی منزل کی طرف پیش رفت کی علامت ہیں۔ لیکن یہی وہ پہلو ہیں جو مغرب کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئے اور سامراجی قوتیں اسلامی احیا کا راستہ روکنے کے لیے علمی اور عملی' ہر سطح پر ایک موثر حکمت عملی سے آراستہ ہو کر میدان میں آگئیں۔ جس صدر صدام حسین کو آج ہٹلر کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے' اسے ہٹلر بنانے کا کام انھی مغربی اقوام نے انجام دیا۔ اسے خطرناک ترین اسلحہ سے مسلح کیا' تمام عرب ممالک نے تیل کی دولت کا بہاؤ اس کی طرف کر دیا اور ایران عراق جنگ کے شعلوں نے مشرق وسطی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ میں ایران اور عرب ممالک کے سات آٹھ سو ارب ڈالر پھونک دیے گئے اور لاکھوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیا گیا۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو امریکہ اور مغربی اقوام نے محسوس کیا کہ عراق کو ایسی عسکری قوت اور بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) حاصل ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں علاقے کی قوت کا توازن اسرائیل کے خلاف ہو سکتا ہے۔ چونکہ اسرائیل کا تحفظ اور علاقے میں اس کی بالادستی امریکی اور یورپی اقوام کے پالیسی اہداف میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے' اس لیے ایک نئی جنگ کی ضرورت تھی جس کے ذریعے عراق کی اس قوت کو تباہ کیا جا سکے اور عرب ممالک کے پاس جو معاشی دولت ہے اس سے انھیں محروم کیا جا سکے۔ ایک طرف صدام کو کویت پر حملہ کے لیے ہری جھنڈی دکھائی گئی (جس کا ثبوت خود امریکی سفیرہ کا بیان اور برطانوی سابق وزیر ٹونی بن کی شہادت ہے کہ خود صدام نے اسے بتایا کہ اسے اس کی ترغیب دی گئی) اور دوسری طرف کسی مشورے کے بغیر اور عوام کی شدید نفرت کے باوجود عرب ممالک کی حفاظت کے نام پر امریکہ اور یورپی اقوام کی فوجیں میدان میں اتار دی گئیں۔ جب جنگ ہوئی تو صدام اور اس کی فوج نے جو ایک طرف "مادر جنگ" کی باتیں کر رہا تھا اور بروقت کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا' عملاً جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے' فوجی قوت کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا' اسرائیل کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور جنگ کا سارا خرچ اور اس کے بعد کی تباہی کی شکل میں سارا خمیازہ عرب ممالک کو بھگتنا پڑا۔ اس کا اندازہ خود عرب مالیاتی فنڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۶۷۰ بلین ڈالر ہے جو پوری اسلامی دنیا کے بیرونی قرض کی رقم سے دوگنا ہے۔ اس سب کے باوجود صدام حسین اسی طرح برسراقتدار رہا اور ہے اور رکھا جائے گا تاکہ امریکی فوجیں عرب سرزمین پر خلیج کے سمندروں پر موجود رہیں' اپنی گرانقدر خدمات کا سود در سود معاوضہ وصول کرتی رہیں' عرب ممالک کے لیے صدام حسین کا "خطرہ" بھی موجود رہے

اور وقتاً فوقتاً ایسی جھڑپیں ہوتی رہیں جن کے نتیجے میں امریکہ اور اسرائیل کو اس علاقے میں اپنے منصوبے پورے کرنے کے مواقع حاصل رہیں۔ یہ ایک ایسا سامراجی کھیل ہے جس کے سارے کردار بچشم سر دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود عوام کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف ناٹک کیے جا رہے ہیں اور مغربی میڈیا کی پوری قوت ذہنوں کو مسخر کرنے اور اپنے مفید مطلب فضا پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ ۱۹۹۱ کی جنگ کے موقع پر تین سفید جھوٹ اس قوت سے اور اس تسلسل سے پھیلائے گئے کہ تمام ذہن مسموم ہو گئے اور جنگ کی فضا بن گئی۔ بعد میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ارادی طور پر محض فضا بنانے اور لوگوں کو مجبور کرنے کے لیے یہ جھوٹ وضع کیے گئے یعنی:

(i) عراق سعودی عرب پر حملہ کرنے کے لیے فوج کشی کر رہا ہے۔

(ii) عراق نیوکلیر پاور بننے والا ہے۔

(iii) عراقی افواج کویت کے ہسپتال سے بچوں کو انکیوبیٹرز (incubators) سے نکال کر لے گئیں اور ہلاک کر ڈالا۔

جنوری ۱۹۹۶ میں برطانیہ کے ٹی وی چینل IV نے The Lies that Made the Gulf War پر ایک دستاویزی فلم بنائی جس میں ان تینوں ارادی اور عمومی جھوٹوں کا پردا چاک کیا اور بتایا کہ کس طرح میڈیا کو جنگ کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں، مسلسل یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے اور آج بھی اسی طرح جنگی فضا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، البتہ موضوع بدل گیا ہے۔ آج کیمیاوی اور حیاتیاتی اسلحے کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ عراق اس پوزیشن میں ہے کہ ساری دنیا کے تمام انسانوں کو گیس اور جراثیم کے ذریعہ ختم کر سکتا ہے۔

ہمیں صدام حسین کی ذات اور عراق کی برسر اقتدار جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ اسی طرح اس ڈرامے کا ایک کردار ہیں جس طرح بہت سے دوسرے--- لیکن ہماری دلچسپی امت مسلمہ سے ہے، خواہ وہ عراق کی سرزمین پر ہو، باقی عرب دنیا میں ہو یا کرہ ارض میں کسی بھی مقام پر۔ ہم اپنی اس رائے کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہمارے پاس مضبوط تاریخی دلائل اور شواہد ہیں کہ گو امریکہ اور اس کی ایجنسیوں نے بارہا بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسرے ممالک کی سیاسی قیادت کو ناجائز ذرائع سے اقتدار سے ہٹایا اور ہلاک تک کیا، جیسے ایران میں ڈاکٹر مصدق اور چلی میں ڈاکٹر سلوا دور الانوے، لیکن صدام حسین کو اقتدار سے ہٹانا ان کا ہدف نہ تھا اور نہ ہے۔ یہ اس لیے کہ صدام کے خطرے کی بنیاد پر وہ پوری عرب دنیا کو بلیک میل کر رہے ہیں اور مزید کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط اور کنٹرول اور اس علاقے پر اسرائیل کی بالادستی اور علاقے میں کسی ایسی قوت کو نہ

بھرنے دینا ہے جو اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔ اس فریم ورک میں صدام حسین اور عراق ان کے بے بڑا مفید مطلب کردار ادا کر رہے ہیں۔ امریکہ کے مشہور رسالے فارن افیرز کا مینجنگ ایڈیٹر جو نیوز ویک کا معاون ایڈیٹر بھی ہے، نیوز ویک میں اس پورے کھیل کی بڑی چشم کشا تصویر گری کرتا ہے۔ پس منظر ہے ۱۹۸۶ میں صدام کی افواج کا عراق کے کرد علاقے میں اقدام، جسے امریکہ اور اقوام متحدہ نے محفوظ علاقہ قرار دیا ہوا ہے اور جس میں امریکہ ایک کرد پارٹی کی دوسروں کے مقابلے میں پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> امریکہ اور صدام حسین کے درمیان تازہ ترین معرکے نے امریکہ کو ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی ہے کہ صدام ابھی زندہ ہے اور صاحب اقتدار ہے۔ کہا جاتا ہے اس سے خلیجی جنگ کے نامکمل اختتام اور مشرق وسطیٰ میں امریکی ڈپلومیسی کی ناکامی واضح ہوتی ہے۔ کوئی بات بھی سچائی سے اتنی دور نہیں ہو سکتی۔ اگر صدام حسین موجود نہ ہوتا تو ہمیں اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کا محور ہے۔ اس کے بغیر واشنگٹن صحرا کی ریت میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔
>
> خلیج فارس صنعتی دنیا کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون، یعنی تیل کے وسیع ذخائر، سے مالا مال ہے۔ یہ علاقہ امریکہ کے لیے غیر معمولی مفادات کا حامل ہے اور امریکہ سے تعلقات کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ توازن اقتدار کی سادہ سیاست کا تقاضا ہے کہ علاقے میں کسی دشمن ریاست کا غلبہ نہ ہو۔ امریکہ نے چالیس سال سے زائد مدت سے ایسی پالیسی برقرار رکھی ہے، واشنگٹن کی علاقے میں پین عرب ازم کی آڑ میں ۱۹۵۰ میں مصر کی بالادستی کی مخالفت سے لے کر ۱۹۹۱ میں عراق پر حملے کی معکوس پالیسی تک۔
>
> امریکہ کو علاقے کے توازن کے لیے ایک طویل المیعاد پالیسی برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے اسے بیرونی دنیا میں حلیفوں کی ضرورت ہے اور ملک میں عوامی حمایت کی بھی۔ صدام حسین کی موجودگی دونوں میں بے حد مدد دیتی ہے۔ اگر صدام نہ ہوتا تو سعودی شاہی خاندان جو امریکہ کی زیر تحفظ ریاست ہے (جیسا کہ وہ ایک لحاظ سے اس وقت ہے) خوفزدہ ہو کر امریکی افواج کو اپنی زمین پر آنے کی اجازت دیتا؟ کیا کویت تیس ہزار سے زائد امریکی جہاز، ٹینک اور دیگر اسلحہ اپنے ہاں رکھتا کہ شاید ضرورت پڑ جائے؟ کیا اردن کے بادشاہ، جو علاقے کے سیاسی بادنما ہیں امریکی میرین دستوں کو اپنے ملک کی حدود میں مشقیں کرنے کی اجازت دیتے؟ (نیوز ویک، ۱۶ ستمبر ۱۹۹۶، ص ۱۷)

صدر فورڈ اور صدر بش کے قومی سلامتی کے مشیر برنٹ اسکوکرافٹ نے بھی اپنے انداز میں صدام کی افادیت، ضرورت نیز اسے نہ ہٹانے کی امریکی پالیسی کا اعتراف کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو نیوز ویک، ۲۳ ستمبر ۹۶، ص ۱۹)

اس کھیل کو جاری رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً ہنگاموں، تصادم کے ڈراموں، فوجی نقل و حرکت اور حسب

ضرورت جنگ اور انسانوں کی ہلاکت کی ضرورت ہے اور یہ کھیل پوری بے دردی کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔ نیز ان خدمات کا معاوضہ بھی پوری ہوشیاری سے وصول کیا جا رہا ہے اور صرف عرب حکومتوں ہی سے نہیں غریب عراقی عوام سے بھی وصول کیا جا رہا ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ۱۹۹۱ میں کس قوت کے ساتھ عراق پر حملہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس آپریشن میں تین ہزار سے زیادہ لڑاکا طیاروں نے حصہ لیا اور ۵ لاکھ کی فوج ظفر موج میدان میں لائی گئی۔ امریکہ نے اپنی کل عالمی فضائی قوت کا ۷۰ فی صد اور کل ٹینک قوت کا ۴۰ فی صد عراق کی "چڑیا" کو مارنے کے لیے استعمال کیا۔ امریکہ نے ویت نام میں ساڑھے آٹھ سال میں ۶۸ ہزار ٹن بم گرائے جبکہ عراق کے خلاف ۴۳ دن میں ایک لاکھ چھ ہزار ٹن--- اور اس طرح عراق کو ایک مقبوضہ ملک بنا ڈالا۔ خلیجی جنگ کے بعد سے اب تک عراق کے ۱۲ لاکھ افراد جنگ یا جنگ کے بعد کے حالات کی وجہ سے جن میں تادیبی کارروائیاں (sanctions) شامل ہیں' ہلاک ہو چکے ہیں۔ ۵ سال سے کم عمر کے بچے جن کی وفات کی شرح ۱۹۹۱ سے پہلے ۵ سو فی مہینہ تھی اب ۶ ہزار ۵ سو فی مہینہ ہے اور ۵ سال سے بڑے بچوں کی موت کی شرح ۱۶ سو ماہانہ سے بڑھ کر ۱۸ ہزار ماہانہ ہو گئی ہے۔ اگر یہ مسلسل نسل کشی (genocide) نہیں تو اور کیا ہے؟

عراق کے اسلحے کے خفیہ ٹھکانوں کی دریافت بھی ایک ہوش ربا اسکینڈل ہے۔ اس تلاش کو اب ساتواں سال ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ انسپکٹر اس کام پر مامور ہیں (واضح رہے کہ عراق نے ان ۴۵۰ میں سے صرف ۴۱ کو امریکہ اور برطانیہ کا جاسوس ہونے کے الزام میں نکل جانے کے لیے کہا تھا اور پھر ہوائی تادیبی حملوں کی دھمکی کے بعد دوبارہ کام شروع کرنے دیا)۔ ساتواں سال ہے اور یہ انسپکٹر اپنا کام مکمل نہیں کر پائے۔ اس عرصے میں یہ عراق کی نیوکلیر استعداد کو ختم کر چکے ہیں' ۳۶ ہزار کیمیکل بم اور آرٹلری شیل' ۶۹۰ ٹن کیمیکل ایجنٹ اور ۸۱۹ میں سے ۸۱۷ اسکڈ میزائل تباہ کر چکے ہیں۔ مختلف صنعتی پلانٹوں کی مکمل تباہی اس کے علاوہ ہے۔ ایک انسپکٹر نے اس ادارے یعنی United Nations Special Commission on Iraq (UNSCI) کے بارے میں صحیح اعتراف کیا ہے کہ اس کے ذریعے ہم عراق پر فاصلاتی کنٹرول (remote control) سے قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ملک کب تک اس طرح کے قبضے کو برداشت کر سکتا ہے؟

یہاں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کس طرح اس معاملے میں بھی دوغلے معیار پر کاربند ہے۔ عراق کو اس کمیشن پر اس کے لامتناہی کردار کے علاوہ دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انسپکٹر عراق کی سیاسی حاکمیت اور اس کے حکمرانوں کی عزت و وقار کو بھی پاؤں میں روندنے پر مصر ہیں اور اس بے عزتی کی کوئی حد نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان انسپکٹروں میں اکثریت امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کی ہے جن

کی عراق دشمنی ایک کھلی حقیقت ہے اور جن سے کسی غیر جانب دار تحقیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اصولاً دونوں اعتراض قابل لحاظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فرانس، روس اور چین نے ان کو وزنی اعتراض قرار دیا ہے اور کمیشن کے سربراہ کے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر، جن میں یہ بھی شامل ہے کہ عراق چاہے تو تل ابیب کو کیمیکل بم سے اڑا سکتا ہے، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ خود اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ مصر ہے کہ وہ بیک وقت پولیس مین، وکیل اور جج کا کردار ادا کرے گا۔ لیکن امریکہ کے دوغلے پن کا پردا اس قانون نے چاک کر دیا ہے جو ابھی ابھی امریکی سینیٹ نے منظور کیا ہے۔ امریکہ نے کیمیاوی ہتھیاروں کی کنونشن (CWC) پر دستخط کر دیے ہیں (پاکستان نے بھی کسی قومی بحث و گفتگو اور پارلیمنٹ اور قوم کو اعتماد میں لیے بغیر اس پر دستخط کر دیے ہیں)۔ اس کنونشن کی رو سے عالمی ادارے کے انسپکٹر شکایت ملنے پر دو ہفتے کے اندر اندر متعلقہ مقامات کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ لیکن امریکہ کا رویہ یہ ہے کہ اس کنونشن کی سینیٹ کی طرف سے توثیق کے بعد بیس مواقع پر معائنے کی جو کوشش ہوئی ہے اس میں دو انسپکٹرز کو امریکہ نے معائنہ نہیں کرنے دیا حالانکہ ان کا تعلق ہیگ کی بین الاقوامی تنظیم Organisation for the Prohibition of Chemical Weapons سے تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ ان میں سے ایک انسپکٹر کا تعلق ایران سے تھا اور دوسرے کا کیوبا سے۔ اگر امریکہ کو یہ اختیار ہے کہ عالمی ادارے کے انسپکٹرز کو ویٹو کر دے تو عراق یا کسی دوسرے ملک کو یہ اختیار کیوں حاصل نہ ہو۔

اس سے بھی بڑھ کر قابل اعتراض، زیر منظوری قانون کی دفعہ ۳۰۷ ہے جس کی رو سے امریکہ اپنے لیے یہ اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے کہ امریکہ اپنی قومی سلامتی کے نام پر جس جگہ کے معائنے کو روکنا چاہے، روک دے۔ قانون یہ اختیار امریکہ کے صدر کو دے رہا ہے اور یہ بھی قانون میں لکھا جا رہا ہے کہ اس قانون کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ متعلقہ دفعات یہ ہیں:

> صدر، امریکہ میں کسی سہولت کے معائنے کی درخواست کو مسترد کر سکتا ہے، اگر صدر یہ فیصلہ کرے کہ یہ معائنہ امریکہ کے قومی سلامتی کے مفادات کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری دفعہ میں یہ لکھا گیا ہے:

> انسپکٹر کی حیثیت سے کام کرنے والے کسی فرد پر صدر کا اعتراض کسی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔

روزنامہ گارڈین نے ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے اسے معائنے کے دوغلے معیار (double standards for inspection) قرار دیا ہے اور صاف الفاظ میں کہا ہے کہ صرف صدام حسین ہی قاعدہ قانون سے نہیں کھیل رہا، امریکہ بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ (Saddam Hussain is not the only one)

stretching the rules)

اس دوغلے پن کے ساتھ کون امریکہ کی اخلاقی پوزیشن کا دفاع کر سکتا ہے؟

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

ایک بڑا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اقوام متحدہ کے نام پر جب چاہے عراق پر چڑھ دوڑے۔ یہ کھیل سات سال سے جاری ہے لیکن اب اس جارحیت کا پردا چاک ہو چکا ہے۔ سلامتی کونسل کی قرارداد ۶۸۷ میں اسلحے کے ذخیروں کے معائنے کا ذکر ہے لیکن اس سلسلے میں قوت کے استعمال کی کوئی اجازت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اس سلسلے میں نئی قرارداد لانا چاہتا ہے مگر امریکہ تیار نہیں کہ کہیں روس، چین یا فرانس اسے ویٹو نہ کر دیں۔ یہ صاف اعتراف ہے اس امر کا کہ معائنے کے مسئلے پر قوت کا استعمال بلا قانونی یا اخلاقی جواز ہے۔ اس مسئلے کے بارے سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے درمیان بھی اتفاق نہیں۔ باقی دنیا بھی اس کی مخالف ہے۔ لیکن امریکہ اپنی من مانی کرنے پر تلا ہوا ہے اور پوری عالمی برادری کے اعتراض کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے رہا اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ صدر کلنٹن نے کئی بار کہا ہے اور اپنے اس سال کے State of the Nation خطاب میں بھی اس کا اعادہ کیا ہے کہ "اگر صدام عالمی برادری کی متفقہ رائے پر نہیں چلتا تو ہم اس کو سزا دینے کے لیے تیار ہیں اور ہم یہ کر کے رہیں گے"۔ اس مسئلے پر امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ سارے ملک قوت کے استعمال کے خلاف ہیں۔ روس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر امریکہ یک طرفہ کارروائی کرتا ہے تو تیسری جنگ عظیم کا خطرہ مول لے گا۔ روس کی پارلیمنٹ (ڈوما) نے باقاعدہ قرارداد منظور کی ہے۔ نیز صدر بورس یلسن نے اٹلی کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

> تاریخ بتاتی ہے کہ عالمی بالادستی قائم کرنے کی کوششیں ہمیشہ مختصر المیعاد ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پرانی عادتوں کے خلاف کام آسان نہیں ہوتا، مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ بعض ممالک کی یہ کوشش کہ دنیا پر یک قطبی ماڈل (unipolar model) مسلط کیا جائے اور دنیا کا قائد بن جایا جائے، غیر حقیقت پسندانہ بلکہ خطرناک ہے۔ (دی گارجین، ۹ فروری ۱۹۸۸، ص ۱۱)

عرب لیگ ۲۲ عرب ممالک کی ترجمان ہے، اس کے سیکرٹری جنرل نے نہ صرف یہ کہ فوجی اقدام کی مخالفت کی ہے بلکہ اسے امریکہ کی ضد اور ہٹ دھرمی قرار دیا ہے۔ انگلستان کے بیشتر قومی اخبارات نے برطانوی حکومت کی پالیسی پر تنقید کی ہے اور اسے امریکہ کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے امریکی اور برطانوی جرنیلوں نے اسے خطرناک اور غیر مفید (unproductive) قرار

دیا ہے اور کہا ہے کہ بجز معصوم انسانوں کے خون بہانے کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ امریکہ کے عسکری اہداف کو مبہم اور "Fuzzy Symbolism" (دی انڈی پنڈنٹ، ۱۲ فروری ۹۸) قرار دیا ہے۔ دانش ور اسے خالص سامراجی کھیل قرار دے رہے ہیں۔ ادیب اور دانش ور ہیرالڈ پنٹر (Harold Pinter) اور کارڈی نل باسل ہیوم نے سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ پنٹر کے الفاظ نقل کرنے کے لائق ہیں:

امریکہ ایک عفریت بن گیا ہے۔ درحقیقت ضرورت یہ ہے کہ امریکہ کو روک دیا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ بہت ہولناک ہے لیکن جو بات ہم نظرانداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے اب غیر حقیقی اور خیالی بنا دیا گیا ہے اور اس حد تک غیر مضر بنا دیا گیا ہے (it has been abstracted now and sanitized to such an extent) کہ مسٹر کلنٹن نے بچوں کو قتل کیا ہے اور انھیں اس کی بالکل پروا بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی درحقیقت غیر حقیقی اور خیالی ہیں! یہ بچے وہ ہیں جو ان کی لگائی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کی یک جہتی کے مسلسل حوالے دیے جاتے ہیں لیکن یہ امریکہ ہے جو اتنی طویل مدت سے بین الاقوامی قانون کی تحقیر کر رہا ہے (held in contempt) کہ وہ اس تصور ہی کو بے معنی کر دینے میں کامیاب ہے۔ امریکہ اب ایک ایسا بے مغز عفریت ہے جو قابو سے باہر ہے۔ (دی انڈی پنڈنٹ، ۱۳ فروری ۹۸)

درجنوں اہل قلم اور سیاسی مبصرین امریکہ کے اس خونی کھیل کی مذمت کر رہے ہیں اور انسانیت کے ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کی دعوت دے رہے ہیں۔

عراق پر اس چڑھائی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی تنفیذ کے نام پر کیا جا رہا ہے، گو ان قراردادوں میں قوت کے استعمال کی اجازت کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن اگر اسے نظرانداز بھی کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا سلامتی کونسل کی قراردادوں کا تعلق صرف عراق سے ہے؟ کیا اسرائیل کے بارے میں جو قراردادیں ہیں وہ صرف تبرک کے لیے ہیں اور ان کی تنفیذ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسرائیل ایک نہیں کئی درجن قراردادوں کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ کھلی کھلی خلاف ورزی کر رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ کیا سلامتی کونسل کی قرارداد ۲۴۲ قابل تنفیذ نہیں؟ کیا سلامتی کونسل نے چالیس سے زیادہ قراردادیں فلسطین میں غیر قانونی آباد کاریوں (settlements) کے بارے میں منظور نہیں کیں؟ ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ۱۹۹۷ میں جنرل اسمبلی نے تین بار اسرائیل کے بیت المقدس میں نئے مکانات تعمیر کرنے کے خلاف صرف ایک ووٹ کی مخالفت سے (یعنی اسرائیل کا واحد ووٹ، امریکہ بھی ان قراردادوں کے بارے میں غیر جانب دار رہا) گویا تقریباً متفقہ طور پر یہ قراردادیں منظور کیں لیکن اسرائیل نے ان پر عمل کرنے سے بڑے حقارت آمیز انداز میں انکار کر دیا۔ کوئی

نہیں جو اسرائیل سے ان قراردادوں پر عمل کرا سکے۔ کیا بھارت کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل کی تین واضح قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی نہیں کر رہا؟ کیا بوسنیا میں اقوام متحدہ کے محفوظ علاقے مقرر کیے جانے کے بعد سربوں پر اس کی قراردادوں کو نافذ کیا گیا؟ کیا آج بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں سلامتی کونسل کی قراردادوں پر امریکہ اور نیٹو کی فوج کی موجودگی میں کوئی عمل ہو رہا ہے؟ کیا اقوام متحدہ کی قراردادیں صرف عراق ہی کے لیے ہیں؟ آخر اس کھلے کھلے دوغلے پن کے بعد امریکہ کے موقف میں کیا اخلاقی یا قانونی وزن باقی رہتا ہے۔ لندن کے اخبار آبزرور نے ادارتی تبصرے میں صحیح کہا ہے کہ: "اس میں یہ مضمر ہو گا کہ اسرائیل بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کی تعمیل کرے"۔

مصر کے مشہور اخبار **الاہرام** نے بھی اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> علاقے میں موجود کش مکش کا الزام عراق پر نہیں اسرائیل پر رکھا جانا چاہیے۔ ہر دفعہ جب امریکہ عراق پر چڑھ دوڑتا ہے، اور اسرائیل کے، جس نے عرب ریاستوں پر قبضہ کر رکھا ہے، کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحے کو نظرانداز کرتا ہے، اس کا دوہرا معیار کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر امریکہ نے عراق کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تو علاقے میں امریکہ کی جو کچھ ساکھ رہ گئی ہے وہ اسے بھی کھو دے گا۔
> **(بحوالہ مڈل ایسٹ انٹرنیشنل، لندن ۱۳ فروری ۹۸، ص ۵)**

حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ اسرائیل کے بارے میں امریکہ خاموش ہے بلکہ یہ سارا کھیل اسرائیل ہی کو علاقے کی بالاترین قوت بنانے کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ گذشتہ ۲۰ سال سے امریکہ ہر سال اسرائیل کو ۱.۲ بلین ڈالر معاشی امداد (قرض نہیں، صاف صاف امداد) اور ۱.۸ ارب ڈالر فوجی امداد دے رہا ہے یعنی ۳ بلین ڈالر۔ یہ اس وقت ہے کہ جب ساری دنیا کے غریب ملکوں کی بیرونی امداد بند ہو گئی ہے یا سودی قرضوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے حالانکہ اسرائیل علاقے کے امیر ترین ممالک میں سے ہے اور اس کی سالانہ قومی آمدنی ان ۲۰ سالوں میں ۲۰ ارب ڈالر سے بڑھ کر ۹۸ ارب ڈالر سالانہ ہو گئی ہے جس کا ۲۰ فی صد وہ جنگی تیاریوں پر خرچ کر رہا ہے۔ آیندہ سال کے لیے امریکہ نے وعدہ کیا ہے کہ اسرائیل کی سالانہ فوجی امداد ۱.۸ ارب ڈالر سے بڑھا کر ۲.۴ ارب ڈالر کر دی جائے گی۔

ایک طرف اسرائیل پر یہ عنایات ہیں اور دوسری طرف اسرائیل کا یہ حال ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں ہی کی دھجیاں نہیں بکھیر رہا، خود اوسلو معاہدہ میں جو وعدے امریکہ سے کیے ہیں ان کا کم سے کم حصہ بھی پورا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ معاہدے کے مطابق اب تک دریائے اردن کے مغربی حصے کا ۳۰ فی صد فلسطینی مقتدرہ کو مل جانا چاہیے تھا لیکن عملاً صرف اڑھائی فی صد حصہ ملا ہے اور مزید دینے پر اسرائیل تیار نہیں۔ اس کے خلاف کسی تادیبی کارروائی کی کوئی بات بھی کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کی ہر ہٹ دھرمی کے جواب میں امریکہ یہی یقین دہانی کرا رہا ہے کہ ہم تمھاری پشت پر ہیں۔

یہ ہے عالمی طاقتوں کا کردار مگر عرب دنیا اور مسلمان امت کی قیادت کا حال یہ ہے کہ اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ امریکہ ہی سے اپنی ساری امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

حالات کے اس جائزے سے سامراجی قوتوں کے اصل کھیل کے خدوخال بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ کو اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے؟ کیا ان قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ کیا اپنے ایمان اور زندگی کے مقاصد کو قربان یا فراموش کر دیں؟ اور نئی غلامی کی ان زنجیروں کو بہ رضا و رغبت پہن لیں؟ یا جس طرح ماضی میں باطل قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے، آج بھی اسی طرح ایک بار پھر صف آرا ہو جائیں اور اللہ کے بھروسے پر اپنے ایمان، اپنے دین، اپنی عزت اور اپنے مستقبل کی خاطر، ہر محاذ پر اور بالآخر عالمی سطح پر، انتفاضہ کا راستہ اختیار کریں۔

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

آزادی، زندگی اور عزت کا یہی ایک راستہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور اور مغلوب ہمیشہ اس طریقے پر عمل پیرا ہو کر ظالموں کے چنگل سے نکلے ہیں اور تاریخ کا رخ بدل گیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی سوپر پاور ہمیشہ کے لیے سوپر پاور نہیں رہ سکتی--- ہر ایک کے اقتدار کے دن محدود ہیں۔ تاریخ کم از کم ۲۶ سوپر پاورز کا قبرستان ہے اور کم از کم دو عالمی قوتوں (برطانیہ اور روس) کو تو ہم نے اپنی زندگی میں سوپر پاور سے گر کر بے بال و پر ہوتے دیکھا ہے۔ ضرورت اپنے مقاصد کے صحیح تعین اور ان کے لیے صبر آزما جدوجہد کی صحیح منصوبہ بندی کی ہے۔ برزنسکی عالم اسلام میں امریکہ کے مستقبل کے رول کے بارے میں کہنے پر مجبور ہوا کہ:

> تاہم اس غلبے کے نہایت سطحی رہنے بلکہ بکھر جانے کا امکان ہے اس لیے کہ امریکہ اور اس کی حاشیہ نشین عرب ریاستوں کے درمیان مشترک اقدار، سیاسی کلچر یا مذہب کے کوئی دیرپا بندھن نہیں ہیں۔ امریکی اقتدار بیشتر مقامی حکومتوں سے حلیفانہ تعلق پر مبنی ہے جو اکثر بدعنوان اور بدنما (obscenely) دولت مند طبقے کی ہیں اور خود اپنے ہی عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ روز افزوں ہے۔ ایسی صورت میں کہ مذہب اور قومیت دونوں ایک اجنبی طاقت کی علاقائی بالادستی کے خلاف ایک ہیں، مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی موجودہ بالادستی کی تعمیر، لفظ کے حقیقی مفہوم میں، بالکل ریت پر ہے۔ اگر عرب اسرائیل تنازعے کو حل کرنے کی امریکی کوششیں ناکام ثابت ہوں تو امریکہ کے لیے عربوں کی مخالفت کا بڑھنا بھی یقینی ہے۔ اسرائیل کے لیے امریکی حمایت کو امریکہ کے اپنے مفادات اور یہودی عوام کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داری کا آئینہ دار سمجھا جا سکتا ہے، لیکن یک طرفہ امریکی جھکاؤ کی صورت

میں، عرب اسرائیل تنازع کے پرامن اختتام کی کوششوں میں ناکامی سے امریکہ کی مسلسل علاقائی بالادستی کے خلاف مذہبی بنیاد پرستی اور قوم پرستانہ انتہا پسندی کے مضبوط ہونے کا امکان ہے۔
(Out of Control، ص ۱۶۲-۱۶۳)

امت مسلمہ کے لیے نجات کا واحد راستہ اپنے گھر کی اصلاح اور درستی میں ہے۔ اللہ پر ایمان اور بھروسہ، عوام کی بیداری، ان کے حقوق کے تحفظ کی جنگ اور سامراجی غلبے اور آمرانہ نظام حکومت کے خلاف عوامی انتفاضہ وہ ہتھیار ہیں جن سے بڑی بڑی جابر قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ، ایک عراق پر امریکی پوزیشن کا نہیں، پوری اسلامی دنیا پر سامراجی تسلط کا ہے اور اس میں صرف باہر کی قوتیں کارفرما نہیں، اندر کے لوگ بھی شریک ہیں۔ بہ یک وقت دونوں کا مقابلہ ہی ہماری آزادی اور دین و ایمان کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اصل خطرات کا صحیح ادراک کیا جائے، اس کھیل کے تمام اداکاروں کو پہچانا جائے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان کی قوت کی آبیاری، عوامی قوت کی تنظیم اور مسلسل جدوجہد کی منصوبہ بندی کی جائے اور فوری نتائج کے خواب دیکھنے کے بجائے زندگی کے ہر محاذ پر ٹھوس اور دیرپا جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ بلاشبہ مسلمان عوام کو امریکہ اور مغربی اقوام کی اس یلغار پر احتجاج بھی کرنا چاہیے اور اپنی حکومتوں کو شرم دلانی چاہیے کہ وہ ان حالات میں محض خاموش تماشائی نہ بنے رہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ مغرب کے کچھ دانش ور، ادیب اور سیاست دان تو امریکہ کے خلاف احتجاج کی آواز اٹھا رہے ہیں لیکن مسلم ممالک کی تنظیم (او آئی سی) خواب غفلت میں مگن ہے۔ مسلمان اور عرب حکمرانوں میں سے کچھ صرف دبی زبان سے معذرت خواہانہ انداز میں کچھ کلمات ادا فرما رہے ہیں جبکہ کچھ دوسروں کا حال یہ ہے کہ ؎

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا ادھر ادھر
پھر سر جھکا کے داخل مے خانہ ہو گیا!

احتجاج اور احتساب وقت کی اولین ضرورت ہیں لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اصل جواب عوامی بیداری اور حق کے لیے جہاد اور انتفاضہ ہے اور اس کے لیے کمربستہ ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے ؎

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے